ڈاکٹر محمد ریاض

اقبالؒ اور معاشرے کی تعمیرِ نو

اقبالؒ نے کوئی اکسٹھ برس عمر پائی اور اس کا معتدبہ حصہ انھوں نے عالمی اور اسلامی معاشرے کی اصلاح اور تعمیرِ نو کی خاطر وقف کر دیا۔ وہ بے شک ایک عظیم فلسفی اور شاعر تھے، مگر ان کی مصلحانہ شان کو ان کے پیغام سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے پہلی مثنوی "اسرارِ خودی" میں اپنی مصلحانہ حیثیت کے بارے میں نہایت خوش اسلوبی سے یہ بتا دیا کہ ان کا مقصد انسانی معاشرے کو عام طور پر اور اسلامی معاشرہ کو خاص طور پر خطاب کرنا ہے:

بہرِ انسان چشمِ من شب ہا گریست — تا دریدم پردۂ اسرارِ زیست
من کہ این شب را چو مہ آراستم — گردِ پای ملّتِ بیضا ستم

ہم یہاں اقبال کے پیغام کو اسلامی معاشرے کی اصلاح تک محدود رکھیں گے، اور یہ اسلامی معاشرہ بھی وہ ہے جو اقبال کا مخاطبِ اوّل تھا یعنی برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کا معاشرہ جس کا ایک حصہ خود ہم لوگ ہیں۔

اقبال نے جس مسلمان معاشرے سے خطاب کیا، وہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ مگر اقبال کے نغمات نے آزادی کی تڑپ کو تیز سے تیز تر کیا اور چند ہی سالوں میں شاعر کی یہ پیشین گوئی پوری ہو گئی کہ:

آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک — بزمِ گل کی ہم نفس، بادِ صبا ہو جائے گی
شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز — اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی

درسِ آزادی کو بار آور ہوتے ہوئے دیکھ کر اقبال نے مسلمانوں کو ایک نئے وطن کی تاسیس و تشکیل کا تصوّر دیا۔ ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں آپ نے جو خطبۂ صدارت پیش کیا، وہ نظریۂ پاکستان کی اساس بنا۔ اور یہ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس میں

آپ نے مسلمانوں کو ایک ممتاز معاشرہ بنانے کی تلقین فرمائی - آپ کا ارشاد تھا : " اگر ہم چاہتے ہیں کہ برصغیر میں اسلام بحیثیت ایک زبردست تمدّنی طاقت کے باقی رہے ، تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ مسلمانوں کی اکثریت والے ان مخصوص علاقوں میں اپنی مرکزیت قائم کر سکے اور یہاں کے مسلمان ایک معاشرہ کی صورت میں جلوہ گر ہوں " آپ عالمِ تصور میں اسی معاشرہ سے مخاطب رہے ہیں - یہ معاشرہ جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے عواقب کے طور پر حکمرانوں کا معتوب و مغضوب اور ہندو اکثریت کے تعصبات کا نشانہ تھا ، اس نے بالعموم ضعف آمیز قناعت ، تقدیر پرستی اور افتراق و نفاق کی روش کو اپنانے سے گریز نہ کیا ، اور نتیجہ ظاہر تھا - اقبال نے اپنے معجز نظام کلام کے ذریعے ، ان خرابیوں کو دور کرنے کی خاطر اپنی توانائی صرف کر دی -

اقبال نے اپنے پیغام کا " تانا بانا " تو اسلامی تعلیمات کے ذریعے ہی تیار کیا ، مگر اس میں ایسی اجتہادی شان اور جرأتِ فکر سے کام لیا کہ طبائع نے اسے پند و وعظ نہ جانا اور سنجیدگی سے توجہ کی گئی - کوئی دو سال قبل ایران کے شہر مشہد میں اقبال کے بارے میں ایک فکر انگیز کتاب " دانائے راز " کے عنوان سے چھپی ہے - اس کے مصنف پروفیسر احمد احمدی بیرجندی ہیں - کتاب کے دیباچے میں مشہد یونیورسٹی کے پروفیسر ، ڈاکٹر غلام حسین یوسفی نے اقبال کی فکری جولانیوں اور جدّت آفرینیوں کے بارے میں بڑی دلگتی باتیں کہی ہیں - وہ لکھتے ہیں : " اقبال مشرق و مغرب میں ایک منفرد شخصیت کے مالک ہیں - وہ نہ خشک واعظ ہیں اور نہ ہی کھوکھلے فلسفی - مولانا رومی کے ساتھ غیر معمولی عقیدت و ارادت رکھنے کے باوجود ، اقبال کی دنیا ہی دوسری ہے اور اپنے معاشرے کو خطاب کرنے کا ان کا رنگ منفرد ہے - اسلامی تعلیمات کو فارسی اور دیگر زبانوں کے شعراء نے اپنے اپنے اشعار میں افراط سے سمویا ہے - مگر اقبال اس معاملے میں از اوّل تا آخر منفرد ہیں - انھوں نے اسلامی حقائق و معارف کو جس طرح بیان فرمایا وہ ان کے عمیق تدبر اور بلند اجتہادی فکر کا مظہر ہیں[۱] " ہم ذرا آگے چل کر اسلامی تعلیمات کے بارے میں اقبال کے ایک اجتہادی نظریہ کا ذکر کریں گے -

اقبال کا معاصر مسلمان معاشرہ غلامی و پسماندگی کے علاوہ افتراق و پراگندگی کا شکار تھا

۱؎ دانائے راز صفحہ ج

وہ جانتے تھے کہ جب تک مسلمان متحد و متفق نہ ہوں، وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اس کی خاطر انھوں نے اتحاد و یگانگت کے درس کو بڑے تنوع اور ایک خاص کلامی رنگ میں پیش فرمایا۔ اس ضمن میں آپ نے اسلام کی اساسِ اوّل، "توحید" کو عملی طور پر اپنانے پر زور دیا۔ نظری حیثیت سے توحید کا مفہوم یہ ہے کہ ایک خدا کی ذات اور اس کی جملہ صفات پر ایمان رکھا جائے۔ توحید نے ہی انسانوں کو معبودانِ باطل کے آگے سرِ تعظیم خم کرنے سے باز رکھا اور ہر دور میں اشرف المخلوق کو اس کا مقام یاد دلایا۔ اقبال نے جس طرح اسلام کے سب ظاہری شعائر پر لکھا، اسی طرح توحید کے بدیہی مفہوم کو بھی واضح کیا۔ مگر آپ نے اسلام کی اساسِ اوّل کے عملی پہلو پر زیادہ زور دیا ہے اور عملی پہلو یہ ہے کہ دعویدارانِ توحید میں ملکی اور بین الاقوامی سطح پر کامل یگانگت، اتحاد اور فکر و عمل کی وحدت کارفرما ہو۔ افتراق و نفاق، اقبال کی نظر میں دعویٔ توحید کے منافی ہے۔ مثنوی اسرار و رموز میں فرماتے ہیں:

اسود از توحید احمر می شود — خویشِ فاروقؓ و ابوذرؓ می شود
ملّت از یک رنگی دلہا ستی — روشن از یک جلوہ این سینا ستی
قوم را اندیشہ ہا باید یکی — در ضمیرش مدعا باید یکی
جذبہ باید در سرشتِ او یکی — ہم عیارِ خوب و زشتِ او یکی
گر نباشد سوزِ حق در سازِ فکر — نیست ممکن این چنیں اندازِ فکر

ضربِ کلیم میں آپ نے علما و متکلمین سے تعریضاً خطاب فرمایا ہے کہ انھوں نے توحید کے اس وسیع مفہوم سے چشم پوشی کی ہے اور اس طرح مسلمانوں کو فکر و عمل کی وحدت کے ایک عظیم سرچشمے سے محروم کر رکھا ہے۔ فرماتے ہیں:

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی 'توحید' کبھی — آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلۂ علمِ کلام
روشن اس ضو سے اگر ظلمتِ کردار نہ ہو — خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام
میں نے اے میرِ سپہ، تیری سپہ دیکھی ہے — قل ھواللہ کی شمشیر سے خالی ہیں نیام
آہ! اس راز سے واقف ہے نہ مُلّا نہ فقیہ — وحدتِ افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام
قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے؟ — اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

توحید چونکہ کوئی فروعی اور اختلافی مسئلہ نہیں (اگرچہ آج کل دیگر اسلامی مسائل کی مانند اسے بھی رونقِ منبر کی خاطر، ایک دوسرے انداز میں اختلافی مسئلہ بنا دیا گیا ہے) اس لیے اقبال فرماتے ہیں کہ ایک مسلمان معاشرے میں (اور ظاہر ہے کہ ہمارا معاشرہ اسی قبیل کا ہے) اس تصور کی خاطر خواہ تنفیذ و تشئید کی جائے۔ علامہ مرحوم نے توحید کی برکات کے تابع، فکر و عمل کے اتحاد کا جو درس دیا، وہ ہمارے لیے آج لمحۂ فکریہ فراہم کر رہا ہے۔ افتراق و تشتت نے ہمیں ایک بہت بڑے بحران سے دوچار کیا، اور نفاق و پراگندگی کا یہ دور دورہ اگر پورے طور پر ختم نہ ہوا تو خدا جانے ہمارا کیا حشر ہوگا؟ اقبال فرماتے ہیں کہ توحید کے عملی پہلو کو ہمارے نظامِ تعلیم کا جزو بنایا جائے اور نونہالانِ ملت کے ذہن میں یہ بات راسخ کر دی جائے کہ اتحادِ فکر و عمل کے بغیر، ہم نہ معاشرہ کی تعمیرِ نو کر سکتے ہیں اور نہ کوئی متحدہ تمدن کو قبول کرنے والی قوم بن سکتے ہیں۔ اگر ملکی سطح پر ہم بے عملی اور عدم یگانگت کا شکار رہیں تو بین الاقوامی طور پر پین اسلام ازم کیونکر ممکن ہوگا:

زانکہ در تکبیر رازِ بودِ تست　　حفظ و نشرِ لا الٰہ مقصودِ تست
می ندانی آیۂ ام الکتاب　　امتِ عادل ترا آمد خطاب
آب و تابِ چہرۂ اقوام تو　　در جہاں شاہد علی الاقوام تو
اینکہ در صد سینہ پیچد یک نفس　　سرّی از اسرارِ توحید است و بس
یک شو و توحید را مشہور کن　　غائبش را از عمل موجود کن[5]

یہاں ضمناً معاشرے کی مناسبت سے 'فرد' کا ذکر کر دینا مناسب ہوگا۔ فرد اور معاشرہ کا تذکرہ مدنیات میں ساتھ ساتھ ہوتا ہے اور اس تلازمے کے بارے میں اقبال کے بعض اشعار امثالِ سائرہ کا مقام حاصل کر چکے ہیں۔ مثلاً:

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں　　موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں
افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر　　ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

---

۵ اسرار و رموز ص ۱۶۲، ۱۶۳

فرد کے لیے اقبال نے 'خودی' کا اور افراد یعنی مجموعی معاشرے کی خاطر 'بیخودی' کا لائحہ عمل پیش کیا جسے اس مختصر مضمون میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ بطورِ اجمال اتنا عرض کر دیں کہ اقبال معاشرے کی تعمیرِ نو کی خاطر، صالح، با استعداد اور مصروفِ عمل افراد کے جویا رہے ہیں۔ اس کام کی خاطر نوجوانوں سے ان کی زیادہ توقعات وابستہ تھیں۔ نوجوانوں کو اقبال نے جاوید نامہ کے آخری حصے "صبحے بہ نژادِ نو" میں خاص طور پر اور اپنی ہر تصنیف میں عام طور پر مخاطب کیا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے دعا فرماتے رہے کہ نوجوان ان کے پیغام سے خاص طور پر بہرہ مند ہوں:

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے　　مرا عشق، میری نظر بخش دے
خدایا آرزو میری یہی ہے　　مرا نورِ بصیرت عام کر دے

اقبال ان نوجوانوں اور عام افراد کی اصلاح و تہذیب کے ذریعے ایک متحد الفکر اور متحد القوت معاشرہ قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس معاشرے میں 'فرد' نیابتِ خداوندی اور قربتِ الٰہی کا احساس پیدا کرتا ہے اور پورا ماحول ان کے درج ذیل دو شعروں کی جیتی جاگتی تصویر بن جاتا ہے:

فرد از توحید لاہوتی شود　　ملت از توحید جبروتی شود
اہلِ حق را حجت و دعویٰ یکی است　　چشم ہائے ما جدا، دلہا یکی است

یہی سبب ہے کہ اقبال 'توحید' کو اسلامی معاشرے کی اساس قرار دیتے ہیں۔

معاشرے میں اضطراب و بے چینی کی ایک بڑی وجہ سیاسی استبداد اور عدمِ حریت کا تداول ہے۔ اقبال کے معاصر معاشرے کو غیر ملکی غاصبوں سے شکایت تھی۔ اور ہم خود اپنوں کے شاکی رہے ہیں، اور ان شکایات کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ایک ربع صدی گزر جانے کے بعد ہمارا معاشرہ آزادی کی راہ پر گامزن ہوا ہے۔ مگر آمریت کے نقوش محو کرنے میں ابھی وقت لگے گا۔ اور معاشرے کی اصلاح کے لیے شدید جدوجہد کرنی ہوگی۔

اقبال استبداد کی ہر صورت کے، ملوکیت ہو یا آمریت، بے حد خلاف تھے۔ یہ صحیح ہے کہ انھوں نے مغرب کے جمہوری نظام پر انتقادات لکھے ہیں۔ پیامِ مشرق اور ضربِ کلیم میں ان کا

لہ جاوید نامہ ص ۲۲۶-۲۲۷

ایک ایک تعریفی قطعہ بے حد معروف ہے۔ مگر یاد رہے کہ اقبال جیسا مفکر انسان کے بنائے ہوئے کسی قانون پر کلیتہً صاد نہیں کرسکتا تھا۔ وہ خوب سے خوب تر کے طالب تھے مگر بادی النظر میں علامہ کا انتقاد جمہوریت پہ تھا۔ یہ چند شعر جو جمہوری دَور میں آزادیٔ افکار کے بارے میں ہیں ان کے عندیے کو ظاہر کردیں گے:

اس قوم میں ہے شوخیٔ اندیشہ خطرناک جس قوم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد
گو فکرِ خداداد سے روشن ہے زمانہ آزادیٔ افکار ہے، ابلیس کی ایجاد
آزادیٔ افکار سے ہے ان کی تباہی رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ
ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

سر فرانسس ینگ ہزبنڈ کے نام علامہ کا ایک مفصل خط، جو ۳۰ جولائی ۱۹۳۰ء کے سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور میں چھپا، بڑا معروف اور فکر انگیز ہے۔ ہمارے معاشرے کی تعمیرِ نو میں جمہوریت کی اہمیت سب پر واضح ہے۔ اس ضمن میں علامہ مرحوم کے خط کا منقولۂ ذیل اقتباس، ہمارے معاشرے کے ہر طبقے، اربابِ اقتدار، حزبِ اختلاف اور عام لوگوں کی خاطر لمحۂ فکریہ اور تازیانۂ فعالیت فراہم کرتا ہے: "جمہوریت میں ایسی تمام خواہشات و شکایات کو پھر سے اُبھرنے کا موقع ملتا ہے جنھیں آمریت کے دَور میں دبا دیا گیا ہو یا پورا نہ کیا گیا ہو۔ جمہوریت ایسی آرزوؤں اور تمناؤں کی موجد ہوتی ہے جو بسا اوقات ناقابلِ عمل ہوتی ہیں۔ جمہوریت کی قوت تقریروں، پارلیمانی بحثوں اور اخبارات کی آرا سے متعین ہوتی ہے۔ اس کے ذریعے لوگ اکثر اپنے مسائل کے ایسے حل قبول کرلیتے ہیں جو معیاری نہیں ہوتے۔ مگر حالات ان کے قبول کرلینے کا تقاضا کرتے ہیں..... جمہوری طرزِ حکومت میں طرح طرح کی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن انسانی تجربہ شاہد ہے کہ کام کرنے والوں کی خاطر، یہ دقتیں ناقابلِ حل نہیں رہتیں۔ جمہوریت کے بارے میں میرا یہی اعتقاد ہے کہ اس کے ذریعے جملہ امور کا حل تلاش کیا جاسکتا ہے"[1] اقبال کے اس فرمان کی روشنی میں ہمیں چاہیے کہ جمہوریت کی اساسات کو راسخ تر کریں اور جمہوری اقدار کی پامالی سے، ہمارے معاشرے کو ماضی میں جو تلخ تجربات ہوئے، ان کا

---

[1] [illegible]

اعادہ نہ ہونے دیں۔

علامہ اقبال نے سیاسی اور معاشی مسائل کا بالعموم ایک ساتھ ذکر کیا ہے۔ سیاسی استحصال معاشی استبداد کا پیش خیمہ ہے اور اقبال کے محبوب ترک رہنما محمد سعید حلیم پاشا (م۔ ۱۹۲۱ء) کی نظر میں بھی دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں[1]۔ پاشا نے موصوف فرماتے ہیں کہ استعمار پسند، ایک استحصال کے ذریعے دوسرے کو کام میں لاتے ہیں۔ سرمایہ داروں کا بھی یہی شیوہ ہے۔ وہ معاشی دباؤ کے ذریعے سیاست میں دخیل ہوتے ہیں اور اس ضمن میں پاکستان کے سیاسی اور معاشی حالات سب کے سامنے ہیں۔ اقبال نے جہاں سیاسی حریت اور جمہوری آزادی کا پیغام دیا، وہاں آپ نے معاشی مساوات، عدم استحصال اور اسلام کے اقتصادی نظام کی تنفیذ و تعدیل کی خاطر صائب مشورے دیئے ہیں۔ البتہ یہ امر افسوسناک ہے کہ اقبال سے اظہارِ عقیدت کرنے والے بعض سرمایہ دار اپنے ہم مذہب وہم وطن افراد کا استحصال کرنے سے باز نہیں آتے۔ حالانکہ ان کی اقبال دوستی کا پہلا تقاضا یہ تھا کہ غریبوں کے استحصال کو ترک کر دیتے۔

یہ نکتہ قابلِ ذکر ہے کہ اقبال کو علم معاشیات سے خاطر خواہ دلچسپی تھی۔ ان کی پہلی منظم تصنیف "علم الاقتصاد" ہے جو ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ کتاب عالم معاشیات، مارشل کے معاشی نظریات سے کسی قدر ہم آہنگ ہونے کے باوجود اقبال کی جدتِ فکر کی غماز ہے۔ برصغیر کے معاشی حالات، مسئلہ آبادی اور خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں مطالعہ کی خاطر یہ کتاب اب بھی سود مند ہے۔ ۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۸ء میں اقبال انگلستان اور جرمنی میں قیام فرما تھے۔ آپ کا موضوع مطالعہ و تحقیق فلسفہ اور قانون تھا۔ اس کے باوجود آپ معاشیات کے دروس میں شامل ہوتے رہے۔ اور یہ امر بھی علم الاقتصاد سے آپ کی دلچسپی کا مظہر ہے۔ اس گزارش سے مدعا یہ ہے کہ معاشی مسائل پر اقبال کا اظہارِ نظر، قیاسات پر مبنی نہیں بلکہ اس کے پیچھے ایک حد تک مہارتِ فن بھی کارفرما ہے۔

اقبال کو سرمایہ دارانہ نظام سے بے انتہا تنفر تھا، اس لیے کہ اس کی بنیاد ہی کمزوروں کے استحصال پر رکھی گئی ہے۔ آپ سوچتے تھے کہ کبھی برصغیر میں اسلامی معاشرہ قائم ہوا، تو نظامِ اسلام

---

[1] دیکھیے میرا مقالہ ماہنامہ المعارف لاہور۔ جولائی ۱۹۷۱ء

کے تقاضوں کے مطابق مسلمان معاشی طور پر خوشحال رہ سکیں گے۔ تاسیسِ پاکستان سے ان کا مقصد قانونِ اسلامی کی تنفیذ تھی تاکہ دیگر مزایا کے علاوہ مسلمان معاشی عدل و انصاف سے بہرہ مند ہو سکیں۔ قائداعظم محمد علی جناح کے نام اپنے ایک مکتوب مورخہ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء میں اقبال نے یہی بات لکھی ہے کہ ایک جداگانہ مملکت کا قیام اس لیے بھی ضروری ہے کہ مسلمان معاشی طور پر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکیں اور کوئی ان کا استحصال نہ کر سکے۔

علامہ کی زندگی کے دوران روس سے سرمایہ داری کے خلاف ایک موثر آواز اٹھی (اور ظاہر ہے کہ بعد میں یہ آواز موثر تر ہوتی گئی) یہ آواز جسے بالشویزم، کمیونزم اور دوسرے نام دیئے جاتے ہیں، علامہ کے لیے نیم دلچسپی کا باعث ضرور تھی۔ آپ کو روسیوں کے نفیِ کامل کے شعار سے 'ابا' تھا۔ مگر چونکہ معاشی مساوات کی یہ صدا اسلام کے غلغلۂ عدل سے اثر پذیر نظر آتی تھی، اس لیے علامہ نے اس کی توصیف کی۔ اقبال کی جامعیت کو بعض سطح بین لوگ ان کی تضاد بیانی قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ اقبال کو روسیوں کی معاشی مساوات پسند تھی مگر ان کی دہریت اور لادینیت ناپسند تھی۔ آپ کے اس قسم کے ملے جلے جذبات جاوید نامہ، مثنوی پس چہ باید کرد اور ضربِ کلیم میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ضربِ کلیم میں ایک قطعہ یہ ہے:

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم — بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ رفتار
اندیشہ ہوا شوخیٔ افکار پہ مجبور — فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
انساں کی ہوس نے جنھیں رکھا تھا چھپا کر — کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں — اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار
جو حرفِ 'قل العفو' میں پوشیدہ ہے اب تک — اس دَور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

'جاوید نامہ' اور 'پس چہ باید کرد' میں آپ نے اس بات کی قومی امید ظاہر کی ہے کہ اہلِ روس منزلِ لا سے نکل کر جادۂ 'الا' میں آجائیں گے۔ ایک مقام پر تو ملتِ روسیہ کو اپنی عاقبت کی فکر کرنے کی آپ نے نصیحت بھی کی ہے:

کردہ ای کارِ خداوندان تمام — بگذر از لا، جانبِ الا خرام
درگذر از لا اگر جوینده ای — تا رہِ اثبات گیری، زندہ ای

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ
ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجو! لن تنالوا البر حتیٰ تنفقوا

سر فرانسس ینگ ہز بنڈ کے نام علامہ کے جس مکتوب کا ذکر ہوا ہے اس میں بھی آپ روسیوں کے رجوع الی الدین کی امید کا اظہار کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اگر وہ اقرارِ خدا کو اپنا شعار بنالیں تو ان کا معاشی نظام، اسلام سے اقرب ہو جائے گا۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اقبال کے نظامِ افکار میں معاشی عدل و انصاف کی بغایت اہمیت ہے۔ آپ غریبوں، مسکینوں، مفلوک الحال مظلوموں کے بے انتہا حامی تھے اور فرماتے ہیں:

بجلالِ تو کہ در دل دگر آرزو ندارم بجز ایں دعا کہ بخشی بکبوتران عقابی[1]
اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے لڑا دے ممولے کو شہباز سے

ہمارے معاشرے کی تعمیرِ نو کے لیے کامل اتحاد کی ضرورت ہے تاکہ ہمارا قومی اور دینی وجود متشخص و معین ہو سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ نوجوانوں کی مناسب تربیت، سیاسی آزادی اور معاشی عدل و مساوات کی ضرورت ہے۔ ان کاموں کی خاطر الحمد للہ بعض اقدامات کیے جا رہے ہیں اور راقم نے اس موضوع پر اقبال کے خیالات کو بالاجمال بیان کر دیا ہے۔ اگر ہم نے مخلصانہ ان خطوط پر معاشرے کی تعمیرِ نو کی کوشش کی، تو ہمیں بالضرور خدائے تعالیٰ کی طرف سے فتح و نصرت نصیب ہوگی۔ موجودہ اوضاع و احوال میں روحِ اقبال گویا ہمارے معاشرے سے مخاطب ہے کہ:

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے؟ خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے؟
عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے؟[2]

---

[1] زبورِ عجم ص ۵۷
[2] ارمغانِ حجاز، ص ۲۵۴